ماہنامہ
قومی ڈائجسٹ
لاہور
اپریل 2019

ممتاز کالم نگار
امیر نواز نیازی
کی دلآویز آپ بیتی

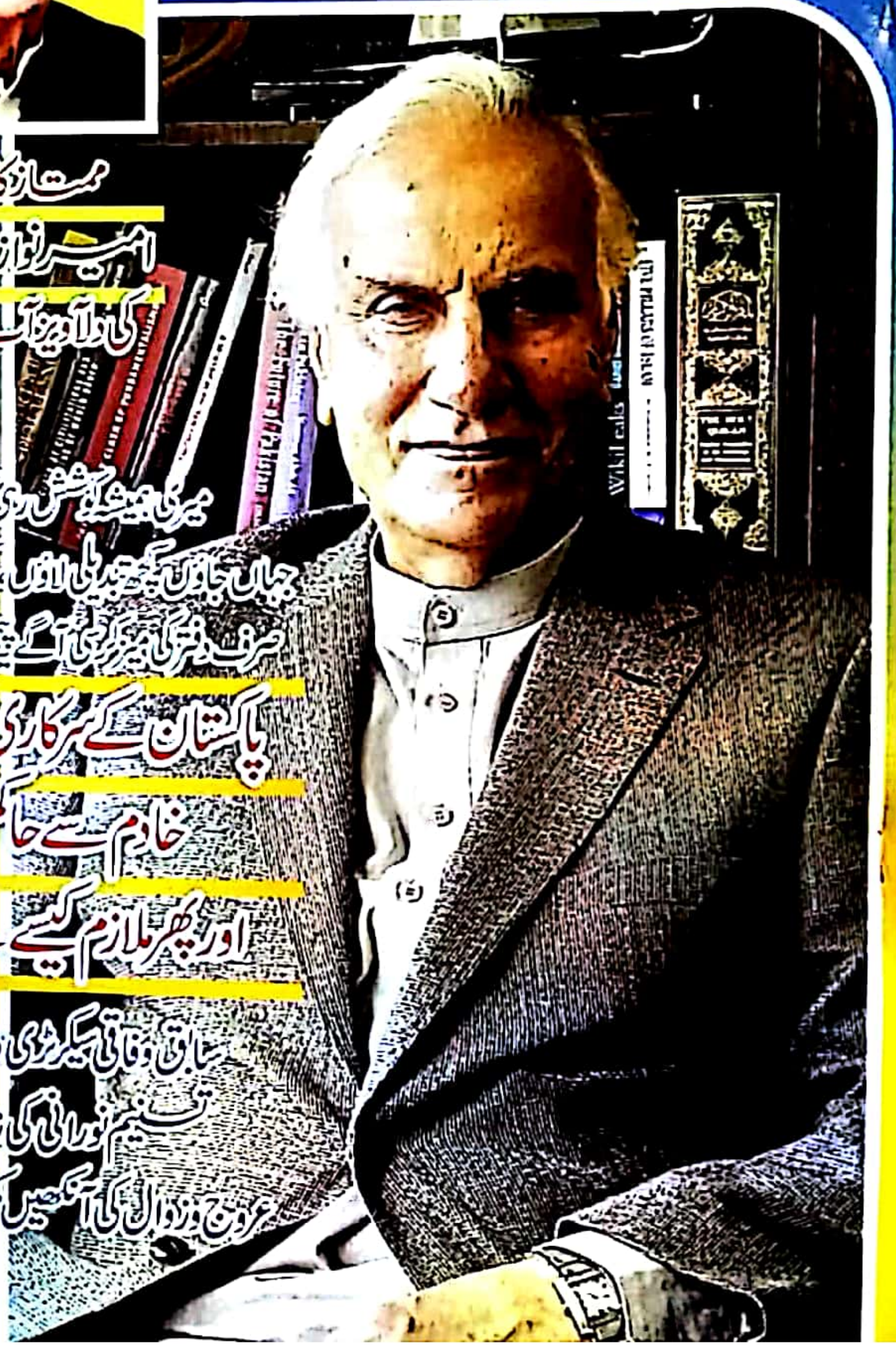

میری ہمیشہ کوشش رہی کہ
جہاں جاؤں کچھ تبدیلی لاؤں، کچھ نیا کروں
صرف دفتری بیوروکریسی آگے پیچھے نہ کروں

پاکستان کے سرکاری افسر
خادم سے حاکم
اور پھر ملازم کیسے بنے؟

سابق وفاقی سیکرٹری داخلہ
تسنیم نورانی کی زبانی
عروج و زوال کی آنکھیں کھولتی کہانی

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

ماہنامہ پاکستان

قوم کے ہر فرد کی آواز

ماہنامہ
قومی ڈائجسٹ
لاہور

اپریل 2019 ◉ جلد 41 ◉ شمارہ 4

سینئر ایڈیٹر	مینجنگ ایڈیٹر	ایڈیٹر	چیف ایڈیٹر
خالد ہمایوں	علی شامی	عثمان شامی	مجیب الرحمن شامی

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

قیمت: پاکستان: 100 روپے۔ سالانہ چندہ: بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک 1440 روپے، بذریعہ عام ڈاک 1000 روپے ۔ متحدہ عرب امارات: 11 درہم ۔ سعودی عرب: 11 سعودی ریال
بیرون ملک بدل اشتراک: سعودی عرب، یو اے ای، بحرین، قطر، تھائی لینڈ، چین، جاپان، کوریا، ہانگ کانگ، سنگاپور، مالدیپ، ڈنمارک، ناروے، فرانس، سویڈن، ہالینڈ، بلجیم، یونان، جرمنی، برطانیہ 4000 روپے انڈونیشیا، ملائیشیا، نائیجریا، جنوبی افریقہ، بھارت، لیبیا، سوڈان، بنگلہ دیش 4000 روپے، آسٹریلیا، کینیڈا، امریکہ 4500 روپے

خط وکتابت کا پتہ: دفتر ماہنامہ قومی ڈائجسٹ 41 جیل روڈ لاہور، فون: 042-35404061-65
فیکس: 042-35404066-67

Email
qaumidigestpak@gmail.com

مجیب الرحمن شامی پرنٹر پبلشر نے قومی پریس سے چھپوا کر 41 جیل روڈ لاہور سے شائع کیا

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

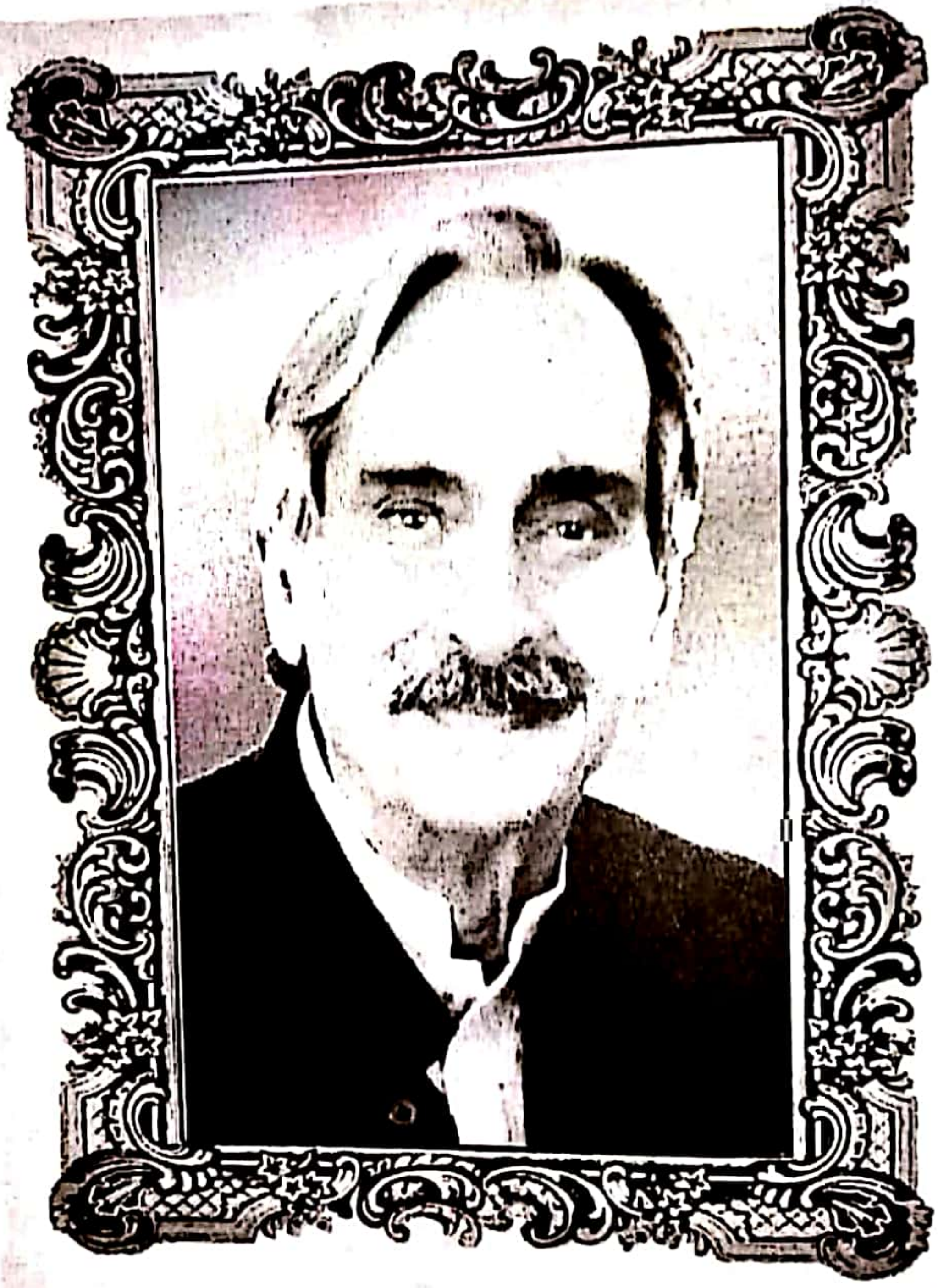

امیر نواز نیازی کی کہانی
خود ان کی اپنی زبانی!!

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ترتیب وتہذیب

عبدالستار اعوان

جناب امیر نواز نیازی ادب اور صحافت کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ ''گر تو برا نہ مانے'' کے عنوان سے فکاہی کالم لکھتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق خطہ مردم خیز میانوالی سے ہے۔ انہوں نے اس وقت قومی اخبارات میں اپنے سحر طراز کالم کے ذریعے قارئین کا ایک وسیع حلقہ قائم کیا جب عطاء الحق قاسمی، وقار انبالوی اور عبدالقادر حسن جیسے قدآور کالم نگاروں کا طوطی بول رہا تھا۔ امیر نواز نیازی اپنے کالم میں مختلف قومی، سیاسی اور سماجی مسائل کو طنز و مزاح کا ''تڑکا'' لگا کر پیش کرتے تو قاری متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ سعد اللہ شاہ کے بقول : ''نیازی صاحب کے ہاں شگفتگی، برجستگی، طنز و مزاح اور بے ساختہ پن بدرجہ اتم موجود ہے اور خاص طور پر ان کی حب الوطنی حرف حرف سے ہویدا ہے۔ ان کا شمار ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جو ملک کے حالات پر کڑھتے ہیں اور بے چین رہتے ہیں کہ ان کا اپنا لہو اس مٹی میں شامل ہے''۔

گزشتہ دنوں مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق ہوا پتا لگا کہ لاہور ہی میں مقیم ہیں لیکن اب بینائی کا نور گم ہونے سے لکھنا پڑھنا چھوڑ چکے ہیں۔ میں حاضرِ خدمت ہوا تو وہ ایسے پرتپاک انداز میں ملے کہ یوں لگا جیسے ان سے برسوں سے میل ملاقات ہے۔ ان کی اب تک آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کالم کے وسیلے سے انہیں چاہنے والوں کا ایک وسیع حلقہ میسر آیا۔ میں نے سوالات یوں ترتیب دیے کہ جواب میں مربوط یادداشتوں کی ایک کہکشاں سی بن گئی۔

جس کی تابانی سے قارئین بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں!

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میں مؤرخہ 28 نومبر 1933ء کو میانوالی کے ایک گاؤں بلوخیل میں پیدا ہوا۔ میرا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ میرے والد صاحب کا نام رب نواز خان نیازی تھا جو پورے علاقہ میں سب سے تگڑے زمین دار تھے، علاقہ بھر میں انہیں نہایت عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ باوجود اس کے کہ میانوالی میں جائیدادوں کے تنازعات اور قتل و غارت گری کا معمول تھا لیکن ہمارے والد صاحب نے نہایت شریفانہ طبیعت پائی تھی اور کبھی کسی جھگڑے میں نہیں پڑے تھے۔ انہوں نے ہماری تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ والد صاحب کا انتقال 1984ء میں ہوا۔ بلوخیل میں ہماری چار ہزار کنال زمین تھی جو چشمہ بیراج پاور پراجیکٹ میں آ گئی تھی اور اس کے عوض ہمیں علاقہ بیجو کلور کوٹ میں زرعی رقبہ الاٹ کیا گیا جہاں پر میرا اب زرعی فارم ہے۔ میرا بچپن اپنے علاقہ میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اور 1949ء میں گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی شہر سے میٹرک اور 1952ء میں گورنمنٹ اصغر مال کالج راولپنڈی سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ انہی دنوں میانوالی میں گورنمنٹ کالج بنا تو میں میانوالی آ گیا اور یہاں سے گریجوایشن کیا۔ اس کے بعد پشاور یونیورسٹی سے ایم اے پولیٹیکل سائنس کے لیے داخلہ لیا اور چند ماہ بعد ہی پنجاب پبلک سروس کمیشن کی طرف سے سپیریئر فاریسٹ سروس کا اشتہار نظر سے گزرا تو میں نے بھی درخواست دے دی اور سلیکٹ ہو گیا۔ 1958ء میں فاریسٹ کالج اینڈ انسٹی ٹیوٹ ایبٹ آباد میں جس روز میری تربیت مکمل ہوئی اور میں پاس آؤٹ ہوا اسی دن فیلڈ مارشل ایوب خان نے ٹیک اوور کر کے پاکستان میں پہلا مارشل لائی راج قائم کیا۔

میں اللہ کا لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے بچپن سے اب تک میرے حصے میں صرف کامیابیاں اور کامرانیاں ہی لکھیں۔ ہم نے آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں خوشحالی دیکھی۔ جس وقت میں پڑھتا تھا تو میرا شمار ٹاپ سٹوڈنٹس میں ہوتا تھا۔ گھومنا پھرنا اور جنگلوں کی سیر کرنا مجھے بہت پسند تھا اور اللہ کا کرم دیکھیں کہ مجھے نوکری بھی ایسی ملی جس میں جنگلوں کی سیاحت ہی سیاحت تھی۔ میں نے محکمہ جنگلات کی سروس کے دوران مشرقی اور مغربی پاکستان کے بہت سے قدرتی جنگلات اور ہل ٹریکس کا خوب نظارہ کیا۔ چٹاگانگ، کھلنا، کشمیر اور پاکستان کا ایک ایک جنگل دیکھا اور فطری نظاروں سے محظوظ ہوا۔ مشرقی پاکستان میں سندر بن کے جنگلوں میں مَیں نے دنیا کا مشہور ترین دھاری دار رائل بنگال ٹائیگر دیکھا، جنگلی ہاتھی اور پتہ نہیں کیا کیا جنگلی حیات دیکھیں اور قدرتی مناظر سے جی بھر کر لطف اندوز ہوا۔ مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ ایڈونچر سندر بن کے جنگلات تھے۔ یہ ایک نہ بھولنے والا سفر تھا۔

سندر بن دنیا کا مشہور ترین مینگرو (Mangrove) فاریسٹ ہے۔ مینگر والے درخت یا پودے کو کہا جاتا ہے جو صرف سمندر کنارے پایا جاتا ہے اور سمندر کے نمکین پانی ہی سے اس کی افزائش ہوتی ہے۔ سندر بن فاریسٹ بھی سمندر کنارے واقع ہے جو ایک خوفناک ترین جنگل ہے۔ یہاں کا رائل بنگال ٹائیگر دنیا میں اور کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ صرف سندر بن ہی کے جنگلات کا باسی ہے۔ سندر بن کی لوکیشن ایسی ہے کہ وہ خلیج بنگال کنارے واقع ہے اور سمندر میں اٹھنے والی لہروں کے مدوجزر ہی سے وہ سیراب ہوتا ہے۔ یہ خوفناک جنگل خشکی میں ہے نہ پانی میں، بس تقریباً دلدلی علاقہ ہے اور ہر

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

طرف کیچڑ ہی کیچڑ (Mud) ہے کہ انسان کا وہاں چلنا محال ہو جاتا ہے۔ اس کا رقبہ بھی بہت زیادہ ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ہماری رہائش ایسی تھی کہ بانسوں کے ذریعے مچان بنا کر اوپر لکڑی کی جھونپڑیاں (Huts) بنائی گئی تھیں۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ دلدلی علاقے اور خوفناک رائل بنگال ٹائیگر کے خطرے کی وجہ سے ریسٹ ہاؤس اس طرح سے تعمیر کیا گیا ہے۔ مچان پر بنی ان جھونپڑیوں میں سندر بن فاریسٹ کا سٹاف بھی رہتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ رات کو بہت محتاط رہنا ہے اور ڈرنا بالکل نہیں کیونکہ رات کے وقت ٹائیگرز اکثر مچان کے نیچے اور دائیں بائیں آ کر خوفناک آوازیں نکالتے اور اپنا شکار تلاش کرتے ہیں۔ ہم نے میزبانوں کی اس بات کو اتنا سیریس نہیں لیا لیکن جب رات سر پر آ گئی اور ہم سونے کے لیے لیٹے تو اچانک ٹائیگرز کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں، ٹائیگرز ہمارے ریسٹ ہاؤس کے اردگرد جمع ہو کر خوفناک آوازیں نکال رہے تھے اور یہ پہلی رات بہت بھاری گزری کہ ہم کہاں موت کے منہ میں آ پھنسے ہیں۔

ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ ٹائیگر کے متعلق عام طور پر کہا جاتا تھا کہ وہ وہاں کے مقامی لوگوں اور شاف کو کچھ نہیں کہتا لیکن دوسرے لوگوں پر حملہ کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ جوان ٹائیگر انسان پر کبھی حملہ نہیں کرتا، صرف بوڑھا ٹائیگر ہی انسان پر حملہ کر کے اسے کھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بتایا گیا کہ بوڑھا ٹائیگر اس لیے انسان پر حملہ کرتا ہے کیونکہ وہ پھرتیلے شکار کو پکڑنے کی طاقت نہیں رکھتا اور اس عمر میں انسان ہی اس کے لیے آسان شکار رہتا ہے۔ ہم نے اپنے میزبانوں مہربانوں سے یہ بھی پوچھا کہ بوڑھے ٹائیگر کی علامت کیا ہوتی ہے، کیونکہ عام آدمی تو ایک جوان اور بوڑھے ٹائیگر میں تمیز نہیں کر سکتا تو انہوں نے بوڑھے ٹائیگر کی واضح نشانی یہ بتائی کہ اس کی دُم پر سے بال مکمل طور پر جھڑ جاتے ہیں، چنانچہ بعد میں ہم نے خود بھی مشاہدہ کیا اور ہمیں جو بھی ایسے بال جھڑے ٹائیگر نظر آتے ہم پہلے ہی محتاط ہو جایا کرتے۔ میرا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ کھلنا اور سندر بن کے بعض ایسے خطرناک مقامات بھی ہیں جہاں آج تک انسان نے رخ نہیں کیا۔ چٹاگانگ ہل ٹریکس اور جنگلات میں خوفناک اور دیوہیکل جنگلی ہاتھیوں کے ساتھ گزرے لمحے آج بھی میرے حافظے سے محو نہیں ہو سکے۔ کھلنا اور سندر بن کے بعد ہم ''کپتائی فاریسٹ'' میں بھی گئے، یہ بھی قدرتی جنگل ہے اور فطرتی حسن ہر قسم کی جنگلی حیات سے لبریز ہے۔ کپتائی فاریسٹ سے یاد آیا کہ جب ہم وہاں گئے تو ''کپتائی ڈیم'' تعمیر ہو رہا تھا، یہاں یہ بتاتا چلوں کہ پورے ایسٹ پاکستان میں جہاں جہاں بھی گئے ہمیں دور دور تک کوئی گدھا نظر نہیں آتا تھا تو ہمارا ایک دوست اکثر کہا کرتا: یار! لگتا ہے یہاں گدھے کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن جب ہم کپتائی ڈیم سائٹ پر گئے تو دیکھا کہ ہر طرف گدھوں کے ہی ریوڑ نظر آ رہے تھے اور ان کے ساتھ بہت زیادہ تعداد میں جو لوگ تھے وہ پٹھان تھے۔ ہم نے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے، پوری دھرتی پر گدھا نظر نہیں آیا اور یہاں پر ہر طرف گدھے ہی گدھے ہیں تو ان صاحب نے بڑے مزے کی بات بتائی کہ یہاں سرنگیں کھودنے کے لیے جب بنگالی مزدوروں کو کام پر لگایا گیا تو وہ بہت بری طرح ناکام ہوئے اور آخر کار مغربی پاکستان کے ایک بڑے کنٹریکٹر کو اس کام کا ٹھیکہ دیا گیا تو وہ اپنے ساتھ صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) سے بڑی تعداد میں یہ گدھے اور

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

پٹھان مزدور لے آیا اور اب بڑی کامیابی سے اس ڈیم پر کام جاری ہے ۔ یہ بھی ہمارے لیے ایک بہت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا۔

ہم 1958ء میں بذریعہ ٹرین لاہور سے امرتسر گئے اور پھر وہاں سے بذریعہ ہوڑہ ایکسپریس کلکتہ (ہوڑہ کلکتہ کا ایک گاؤں ہے) اور پھر ایسٹ پاکستان میں ''کھلنا'' تک پہنچے۔ ہمیں ایسٹ پاکستان میں ٹرین پر سفر کرتے ہوئے بار بار اتر کر ٹرین تبدیل کرنا پڑتی کیونکہ وہاں ندی نالے اتنے زیادہ ہیں اور اس قدر بارشی ایریا ہے کہ بار بار ایک ٹرین سے اتر کر دوسری پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ مشرقی پاکستان میں میرے دن بہت ہی سہانے گزرے اور جب 1971ء میں مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا تو میرے دل پر بہت زیادہ افسردگی چھا گئی کیونکہ وہ میرے خوابوں کی سرزمین تھی، اس پر گزرے شب و روز مجھے آج بھی بہت یاد آتے ہیں اور تڑپاتے ہیں۔

جہاں تک میرے لکھنے اور پڑھنے کے ذوق کی بات ہے تو جن دنوں میں میانوالی ڈگری کالج میں گریجوایشن کر رہا تھا تو کالج لائبریری سے کتابیں لے کر ان کا مطالعہ کرتا اور پھر آہستہ آہستہ میں نے اپنا مافی الضمیر ہلکے پھلکے اشعار کی صورت میں بیان کرنا شروع کیا۔ ان دنوں میں کالج کے بلیک بورڈ یا نوٹس بورڈ پر کوئی شعر لکھ دیتا تو وہ کئی کئی دن تک کالج کے لڑکوں کی زبان پر رہتا۔ یہ شاعری اساتذہ اور کچھ دوستوں کی اشعار کے ذریعے تصویر کشی پر مبنی ہوتی جو طلبہ میں سینہ بہ سینہ آگے چلتی۔ اس دور کے بہت سے اشعار تو میں بھول چکا ہوں تاہم چند ایک یاد ہیں جن کا میں اکثر مجلسوں میں ذکر کرتا ہوں۔ ان دنوں پاکستان نیا نیا بنا تھا، پروفیسر ظہور الحسن ارزش فارسی کے ہمارے استاد تھے اور تازہ تازہ بھارت سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی اور فارسی ان کا اوڑھنا بچھونا۔ بہت عمدہ اور قادر الکلام شاعر تھے، اپنا کلام ترنم سے سنایا کرتے ۔ انہیں اردو کے عظیم شاعر اور ادیب جوش ملیح آبادی کا بھی قرب حاصل رہا اور ان کا ذکر جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' میں بھی نہایت محبت کے ساتھ کیا ہے۔ ارزش صاحب کی آواز جہاں بے حد سریلی تھی، وہاں بینجو (میوزک انسٹرومنٹ) بجانے کے بھی بہت ماہر تھے۔ دیکھنے میں بھی وہ گورے چٹے، ورزشی بدن، خوش پوش اور خوش مزاج ، ہمیشہ ہنستے مسکراتے نظر آتے۔ پان کے وہ بہت رسیا تھے اور ان کے ہونٹوں کی مستقل لالی اس کی بھرپور غمازی کرتی تھی۔ طلبہ میں وہ گھل مل جایا کرتے ، گپ شپ اور ہنسی مذاق کے بھی ماہر تھے اور اسی گپ شپ میں بعض اوقات لمبی لمبی بھی چھوڑ جاتے اور پکڑائی نہیں دیتے تھے۔ تو میں نے شرارت کے طور پر ان پر نظم لکھ ڈالی جو کالج بھر میں مشہور ہوئی۔ انہوں نے سنی تو مسکرا کر کہا شاباش لگے رہو۔ وہ نظم اگرچہ اب میں بھول گیا ہوں لیکن اس کا ایک آدھ شعر آج بھی مجھے یاد ہے۔ شعر کچھ یوں ہے

یہ ہیں ارزش، سراپا ورزش، پان سے ہونٹ سجاتے ہیں
اڈلٹریشن کے ہیں ماہر، سچ میں جھوٹ ملاتے ہیں

اسی طرح ایک زیدی صاحب ہسٹری کے پروفیسر تھے ،کم گو تھے اور کسی حد تک سڑیل مزاج بھی۔ بہت کم فری ہوتے تھے۔ سنیارٹی کے لحاظ سے ایک قاری صاحب کالج پرنسپل تھے تو زیدی صاحب وائس پرنسپل ۔ جس دن قاری صاحب چھٹی پر ہوتے تو زیدی صاحب پورے کالج میں خوب رعب جماتے پھرتے۔ ان دنوں کالج کے پروفیسرز عام طور پر سائیکلوں پر کالج آتے جاتے تھے اور زیدی صاحب

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

کے پاس بھی سائیکل تھی۔ زیدی صاحب کا سائیکل پر بیٹھنے کا انداز بھی منفرد تھا۔ اس طرح اکڑ کر بیٹھتے تھے جیسے کوئی بچہ اپنی سلیٹ پر "1" کا ہندسہ لکھتا ہے۔ تو ان کے متعلق میں نے جو اشعار لکھے ان میں سے مجھے جو یاد ہیں وہ یہ ہیں۔

یہ ہیں زیدی، گھر کے بھیدی، لنکا خوب ڈھاتے ہیں
"قاری" ہوں جو چھٹی پر تو، خوب اکڑ کر آتے ہیں
بیٹھیں جب یہ سائیکل پر تو "ایک نمبر" بن جاتے ہیں

یہ اشعار کسی شرارتی طالب علم نے ان کے کلاس روم کے بلیک بورڈ پر لکھ دیے تو زیدی صاحب پڑھ کر مجھ پر بہت برہم ہوئے اور میں ایک عرصہ تک ان سے نظریں چرا تا رہا۔ دوسری طرف علم و ادب سے گہری محبت کی ایک بڑی تحریک مجھے نوائے وقت سے بھی ملی جو ہمارے گھر میں باقاعدہ آتا تھا اور ہمارے گھر والے اور دیگر عزیز و اقارب یہی اخبار بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ یوں وقت کے ساتھ ساتھ "نوائے وقت" ہی میری ترجیح بن گیا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب میں نے خود کالم لکھنا شروع کر دیے۔

بعض لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کالم نگاری ادب ہی کی ایک صنف ہے کیونکہ اکثر لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے، یوں کالم کی کوئی مستقل اور ٹھوس تعریف موجود نہیں تو اس کے متعلق میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ بس میرا کام تو تھا لکھنا اب اسے کیا نام دیا جاتا ہے تو اس کا فیصلہ ادب پر گہری نظر رکھنے والوں نے کرنا ہے۔ تاہم اتنا عرض کرتا چلوں کہ عام طور پر ایک اخباری کالم کو "لٹریری اِن ہری" (یعنی: تیزی میں لکھا ہوا ادب) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ایک ادبی مجلس میں مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ نے ایک طویل عرصہ تک اخبارات میں لکھا، لیکن آپ کی تحریروں میں کسی خاص سیاسی جماعت یا کسی دھڑے کی حمایت کا قطعی کوئی تاثر نہیں ابھرتا، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو میں نے برملا جواب دیا کہ میرا شروع سے یہی نقطہ نظر تھا کہ مجھے صرف پاکستان ہی کے لیے لکھنا ہے اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے کالموں میں کبھی کسی جماعت کی نمائندگی کا کردار ہرگز ادا نہیں کیا۔ دراصل کالج دور ہی میں مجھ میں طنزیہ اور مزاحیہ انداز سرایت کر گیا تھا۔ اصل میں مَیں یہ سمجھتا تھا کہ اپنی جو بھی بات کروں اس شگفتہ انداز سے کروں کہ تلخی کا اس میں کوئی نام و نشان نہ ہو، جو کسی کی طبیعت پر گراں گزرے۔ بس یہی سوچ کر میں نے یہ اسلوب اپنایا اور پھر اسی پر قائم رہا۔ ڈاکٹر اجمل نیازی نے ایک بار کسی ادبی محفل میں کہا تھا کہ امیر نواز نیازی سخت سے سخت بات بھی کر جاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ جاتا ہے کہ "گر تو برا نہ مانے"۔ اب ظاہر ہے ایسے میں برا کون مانے گا۔

میانوالی کالج کے دنوں میں مَیں نے شاعری بھی بہت پڑھی اور ناول بھی بہت پڑھے۔ شعرا میں مجھے غالب اور فیض احمد فیض نے بہت متاثر کیا اور ناول کی دنیا میں نسیم حجازی میرے اعصاب پر چھائے رہے۔ اس دور میں تقریباً ہر پڑھے لکھے گھرانے میں بچوں کے ساتھ یہی مسئلہ تھا کہ والدین نصابی کتابوں کے علاوہ کسی کتاب کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے، مجھے بھی یہی معاملہ درپیش تھا لیکن بہرحال میں نے والدین سے چھپ چھپ کر نسیم حجازی کے ناول پڑھ لیے تھے۔ کالج کی ہر قسم کی سرگرمیوں میں بھی میں نے ضرور حصہ لیا۔ مجھے تقریر کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ایک بار مجھے انگریزی میں تقریر کرنے کو کہا گیا اور جب میں روسٹرم پر کھڑا ہوا تو طلبہ نے بہت زیادہ ہوٹنگ کی جس کی وجہ سے میں تقریر نہ کرسکا۔ اسی طرح طلبہ سیاست میں مَیں نے بس اس حد تک

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دلچسپی لی تھی کہ ایک بار سیکرٹری جنرل کا الیکشن لڑا اور ناکام ہوا، بس پھر طلبہ سیاست سے بالکل کنارہ کش ہوگیا۔

جہاں تک میرے نثری مضامین لکھنے کی بات ہے تو میں کالج کے زمانے ہی سے لکھنے لگا تھا۔ کالج میگزین ''سہیل'' میں لکھنا شروع کیا اور پھر اس کا ایڈیٹر بھی بنادیا گیا۔ بعدازاں ادارہ نوائے وقت کے رسالے ''قندیل'' میں لکھا، اسی طرح دوران ملازمت بھی اخبارات میں کالم لکھا کرتا۔ میرا پہلا کالم 1978ء میں اس وقت نوائے وقت میں شائع ہوا جب میں نے ممتاز ادیب وقار انبالوی کے مشہور زمانہ فکاہیہ کالم ''سر راہے'' کے جواب میں تین قسطوں میں کالم لکھا اور یہ نوائے وقت میں ''دیکھتا چلا گیا'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس پر وقار انبالوی نے نہایت اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے کالم میں خوبصورت تبصرہ کیا تو میرا حوصلہ اس قدر بڑھا جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔

یوں تو میں طالب علمی کے زمانہ سے لکھتا رہا تاہم 1993ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مستقل کالم لکھنا شروع کیا۔ روزنامہ جنگ سے وابستہ ہوا اور میرا کالم ''گرتو برا نہ مانے'' کے عنوان سے جلوہ گر ہوا۔ میرا یہ طنزیہ ومزاحیہ کالم روزانہ شائع ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ کالم روزنامہ خبریں اور پھر نوائے وقت میں منتقل ہوگیا۔ درمیان کے کچھ عرصہ میں مجیب الرحمٰن شامی کے اخبار روزنامہ پاکستان کے لیے بھی لکھا۔ اور سب سے آخر میں دوبارہ روزنامہ نوائے وقت سے وابستہ ہوا اور 2008ء تک نوائے وقت ہی میں لکھتا رہا۔ پاکستان اخبار میں شامی صاحب اور قدرت اللہ چودھری کے ساتھ ہماری بہت گپ شپ رہتی۔ قدرت اللہ چودھری کو میں ایک ماہر اور مستند اخبار نویس اور علم دوست شخصیت تصور کرتا ہوں۔

میں نے کالج کے زمانہ سے لے کر 2007ء تک مسلسل لکھا اور پھر میرے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوئی کہ میری بصارت جواب دے گئی اور 2008ء میں نظر بالکل ختم ہوگئی تو میں نے نوائے وقت میں آخری کالم ''جب چراغوں میں روشنی نہ رہی'' لکھا۔ اس کالم میں میں نے اپنی بیماری کے متعلق لکھا تھا کہ یہ میرا آخری کالم ہے۔ اس کالم کے چھپنے کی دیر تھی کہ کئی دن تک میرے فون کی گھنٹیاں مسلسل بجتی رہیں اور پاکستان بھر سے قارئین نے مجھے بہت زیادہ کالیں کیں اور ہر طرح کی مدد کی آفرز کیں۔ اس وقت مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میرے قارئین کا حلقہ تو بہت زیادہ ہے جو ٹوٹ کر مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ان تمام رابطہ کرنے والوں سے میں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ جو بیماری مجھے لاحق ہوچکی ہے اس کا علاج تو امریکہ میں بھی نہیں ہے۔ بس آپ لوگ میرے لیے دعا کیجیے۔ جب میری آنکھیں بے نور ہوگئیں تو چند اشعار میری زبان سے جاری ہوئے جواب بھی زبان پر رہتے ہیں۔ اپنی ان مختصر یادداشتوں میں ان اشعار کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عنوان ہے: ''آنکھیں جو بے نور ہوئیں''۔

میرے خدا، ان آنکھوں سے کیا قصور ہوا
کہ دیدار یار مجھ سے دور ہوا
وہ جو روٹھ گئی بینائی مجھ سے
کیوں میرا جہاں، ناگہاں بے نور ہوا
سجا رکھا تھا ، جودل میں اپنے
وہ نقش ِ یار ،چکنا چُور ہوا
وہ نظارے جو دور ہوئے،سارے
جرم تو مجھ سے کوئی ضرور ہوا

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی مجھ کو
میرے خدا، میں کس قدر مجبور ہوا
دن بھی لگے اب رات کی مانند
کٹھن یہ راستہ میرے حضور ہوا
دکھ تو یہ ہے، دکھ چھپاؤں کیسے
یہ حادثہ تو گلی گلی مشہور ہوا
میں بھی راضی برضا ہوں نیازی
کہ ایسا ہی، خدا کو منظور ہوا

مجھے جن شگفتہ اہلِ قلم نے متاثر کیا ان میں مشتاق یوسفی اور کرنل محمد خان سرفہرست ہیں۔اس کے علاوہ ہمارے دور کے ایک اہم ساتھی تھے سید خورشید گیلانی (مرحوم) میں ان کی خداداد صلاحیتوں کا بھی بہت معترف تھا۔افسوس کہ انہیں عین شباب میں موت نے آلیا۔اسی طرح زمانہ طالب علمی میں ایک پنڈی کے استاد تھے ظہور الحسن ارزش جن کا تفصیلی ذکر پہلے کر چکا ہوں ان سے بھی دوران طالب علمی متاثر ہوا۔ سیاستدانوں میں مجھے سب سے زیادہ نواب آف کالاباغ امیر محمد خان نے متاثر کیا۔

جن دنوں میں چھانگامانگا جنگل میں بطور فاریسٹ افسر انچارج تعینات تھا،نواب آف کالاباغ ملک امیر محمد خان گورنر مغربی پاکستان تھے۔نواب صاحب قدرتی جنگلات کے بے حد دلدادہ تھے، ہمارے پاس اکثر وبیشتر آتے رہتے۔نواب صاحب کے حکم پر چھانگامانگا کو پبلک پارک کے طور پر ڈیکلیئر کیا گیا اور انہوں نے بہت زیادہ کام بھی کروایا۔ ریسٹ ہاؤس، جھیل بنوائی اور دیگر اہم ڈویلپمنٹ ہوئی۔ایوب خان بھی آتے تھے اور دیگر بہت سارے وفاقی اور صوبائی وزراء بھی۔اکثر پاکستانی فلموں کی شوٹنگ بھی وہیں پر ہوتی تھی اور بہت سے فن کاروں اور اداکاروں سے واسطہ بھی پڑتا تھا۔ایک مرتبہ سنتوش کمار آئے اور خوب محفل برپا ہوئی۔ملکہ ترنم نور جہاں اور ان کا بیٹا اکبر رضوی بھی آتے اور ان کے ساتھ بہت ملاقاتیں رہیں۔نواب آف کالاباغ کے ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ایک مرتبہ نواب صاحب نے چھانگامانگا آنا تھا اور ہم نے ان کے استقبال کی خوب تیاری کی۔جھیل میں موجود ایک کشتی پر ہم نے رنگ روغن بھی کروایا اور زبردست ڈیکوریشن کی، ابھی یہ رنگ خشک بھی نہیں ہوا تھا کہ نواب صاحب اچانک آگئے اور سیدھے جا کر کشتی پر بیٹھ گئے، جھیل کا ایک چکر لگایا اور جب وہ کشتی سے اترے تو ان کی شیروانی پر پیچھے سے مکمل رنگ لگ گیا۔ اب ہم بہت پریشان ہوئے کہ انہیں کیسے بتائیں اور کیا کریں، کیونکہ کسی کو بھی ان کے جاہ وجلال کے آگے بات کرنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔آخرکار ان کے ایک ذاتی ملازم نے قوت مجتمع کر کے ذرا ہمت سے کام لیتے ہوئے نواب صاحب کو بتایا تو انہوں نے حیرت انگیز طور پر بڑے تحمل سے اپنی شیروانی دیکھی اور صرف اتنا کہا: ’’اوے کم بختو!میری شیروانی کی مت ماردی‘‘۔اسی طرح میں جب بھی نواب صاحب سے بات کرتا تو کہتا: ’’نواب صاحب اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں، ویسے آپ کے پاس جان کی امان ہے نہیں!‘‘ تو اس پر وہ مسکرا دیتے۔وہ اچھے وضع دار انسان تھے۔انہوں نے حکمرانی کا حق ادا کیا اور عوام کے حقوق کا حتی الوسع خیال رکھا۔

ایک مرتبہ نواب صاحب ہمارے پاس چھانگامانگا جنگل آئے تو ہم نے ان کے اعزاز میں گائیکی کی ایک محفل کا انتظام کیا۔مشہور فلمی پلے بیک سنگر منیر حسین نے نواب صاحب کی موجودگی میں فیض احمد فیض کے یہ اشعار گانے شروع کیے:

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

سنگرا اپنی لہر میں یہ اشعار گائے جا رہا تھا، محفل عروج پر تھی اور ہم نے دیکھا کہ نواب صاحب کے چہرے پر کئی طرح کے رنگ آ جا رہے تھے۔ ان کے چہرے کے تیوروں سے ہم بہت ڈر رہے تھے کیونکہ وہ اچھے خاصے مسکراتے مسکراتے اچانک سیریس ہو گئے تھے لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔ اس کے بعد وہ جب بھی ہمارے پاس آتے تو پہلے حکم یہی دیتے کہ بھئی! کسی قسم کی تقریریں یا شعروشاعری کی محفل سجانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اس سے ہم نے تو خدا کا لاکھ شکر ادا کیا کہ چلو ہمارا بھی فائدہ ہوا اور اس زائد سرکاری ڈیوٹی سے ہماری جان چھوٹ گئی۔

یہاں ایک اور دلچسپ بات یاد آ گئی نواب آف کالاباغ ملک امیر محمد خان نے گورنری کا استعفیٰ فیلڈ مارشل ایوب خان کو پیش کیا اور گھر چلے گئے تو اس کے بعد ایک دن ملک فیروز خان نون ہمارے پاس گھومنے پھرنے چھانگا مانگا آئے۔ انہوں نے میرے آفس میں آویزاں ملک امیر محمد خان کی تصویریں دیکھیں تو کہنے لگے یار! اب یہ تصویریں اتار دو کیونکہ ایوب خان کو پتہ چل گیا تو وہ تمہاری ایسی تیسی پھیر دے گا (اس بات سے ہمارے حکمرانوں اور مقتدر طبقے کی کم ظرفی کا بھی بخوبی پتہ چلتا ہے) تو میں نے جواب دیا کہ ملک صاحب! امیر محمد خان تو ایک ہسٹری ہے اور ہسٹری کو کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال میں ذاتی طور پر امیر محمد خان کو بہت ہی ایماندار اور دلیر حکمران سمجھتا ہوں۔ میں جب تک چھانگا مانگا میں رہا وہ تصویریں وہاں لگی رہیں، میرے وہاں سے چلے آنے کے بعد وہ تصویریں اتار دی گئیں۔

خامیاں اور خوبیاں تو ہر بندے میں ہوتی ہیں اور یہ بشری تقاضا بھی ہے، نواب صاحب میں خامیاں بھی یقیناً ہوں گی لیکن ان کی خوبیاں ان کی خامیوں کی نسبت بہت نمایاں تھیں۔ ایک تو وہ کرپٹ اور عیاش حکمران قطعی نہ تھے، نماز روزہ کے پابند تھے اور حیادار، وضعدار انسان تھے۔ عوام دوست تھے اور تمام سرکاری محکموں کے افسران کو کہتے کہ اپنی ذمہ داریوں پر توجہ دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نواب صاحب بہادر بھی بہت تھے۔ چھ ستمبر 1965ء کی جنگ شروع ہوئی تو لاہور میں موجود تمام افسرشاہی بھاگ کھڑی ہوئی اور گاڑیاں تیزی سے لاہور سے باہر نکل رہی تھیں، اس وقت نواب صاحب مری میں تھے اور انہیں جنرل ایوب نے کہا کہ جنگ کی وجہ سے آپ اپنا آفس عارضی طور پر جوہرآباد میں قائم کر لیں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ فوری طور پر لاہور پہنچے تو راوی پل پر میں نے خود دیکھا کہ ساری گاڑیاں لاہور سے نکل رہی تھیں اور صرف نواب صاحب کی گاڑی لاہور میں داخل ہو رہی تھی۔ انہوں نے فوراً اعلان کیا کہ کوئی بھی ملازم یا افسر لاہور سے باہر نہیں جائے گا اور تمام دفاتر معمول کے مطابق کھلیں گے اور کام کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

نواب امیر محمد خان کا دور بہت یادگار تھا جو آج بھی میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی قومی ذمہ داری کا بخوبی احساس تھا اور وہ عظیم لوگ تھے۔ نواب صاحب جب بھی ہمارے پاس آتے تو ہم سیکورٹی کا خاطر خواہ انتظام کرتے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب کہنے لگے کہ میری سیکورٹی کی فکر بالکل نہ کیا کرو کیونکہ مجھے جو بندہ بھی مارے گا وہ باہر سے

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner

نہیں آئے گا، مجھے مارنے والا کوئی اپنا ہی ہوگا تو اس قدر سیکورٹی کا تکلف کیوں اٹھاتے ہیں۔اور جب نواب صاحب اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوئے اور مجھے اس کی خبر ملی تو میرے کانوں میں ان کی یہی بات بار بار گونجنے لگی تھی کہ ''مجھے کوئی اپنا ہی مارے گا''۔

نواب آف کالاباغ سے یاد آیا کہ جن شخصیات کے ساتھ میرا تعلق واسطہ رہا اور جن کے کردار نے مجھے بے حد متاثر کیا ان میں نوائے وقت کے مالک اور ایڈیٹر مجید نظامی بھی سرفہرست ہیں۔وہ ایک عظیم انسان تھے۔مصروفیت کے باوجود مجھے وقت دیتے اور گپ شپ لگاتے، بلکہ وہ اپنے ہر ملنے والے کے ساتھ یہی برتاؤ کرتے اور ملنے والے کو قطعی طور پر اپنی مصروفیت کا نہ بتاتے کہ میں مصروف ہوں اور پھر کسی وقت آیئے، میں جب ان کے آفس جاتا، وہ کام چھوڑ کر بھرپور وقت دیتے۔ جب کبھی ان سے ملنا ہوتا انہیں اس قدر شفیق وخلیق، نرم خو اور نرم دل پایا کہ جسے میں بیان نہیں کرسکتا۔ان کا اندازِ گفتگو دھیما، ہشاش بشاش چہرہ اور اس پر ہر وقت سکون کی کیفیت ہوتی تھی۔فیلڈ مارشل ایوب خان کے زمانے میں سرکاری دفتروں میں نوائے وقت کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا تو اس پابندی کی زد میں ہمارا ادارہ بھی آیا اور میں سرکاری ملازم ہونے کے باوجود باقاعدہ یہ اخبار منگوایا کرتا۔ اس ''حکم عدولی'' پر دو تین بار میری جواب طلبی بھی ہوئی لیکن نوائے وقت اور مجید نظامی سے میرا رشتہ نہ ٹوٹ پایا۔مجید نظامی اسلام اور پاکستان کے سچے خیر خواہ تھے۔پاکستان ستائیسویں رمضان کو معرض وجود میں آیا تو جناب نظامی کی قسمت دیکھیے کہ اسی مبارک رات کو ان کی وفات ہوئی۔

شخصیات کا تذکرہ چل نکلا ہے تو یہاں پر میں میانوالی کے ایک دُرِ نایاب سید نصیر شاہ کا ذکر نہ کروں تو سخت ناانصافی ہوگی۔شاہ صاحب معروف شاعر، نثر نگار، محقق، دانش ور اور مذہبی سکالر تھے۔وہ میانوالی جیسے پسماندہ خطے ہی میں بیٹھے رہے۔وہ درحقیقت گدڑی میں چھپا ایک لعل تھا۔سید نصیر شاہ صاحب کے جد امجد شیخ المشائخ سید جلال الدین جیلانی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے۔ وہ دین کی تبلیغ کرتے کرتے دریائے سندھ کے بالائی علاقہ کچھی میں چلے آئے اور یہاں انہیں میاں علی سے پکارا جانے لگا۔میانوالی شہر انہی کے نام منسوب ہوا۔سید نصیر شاہ اسی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ علم اور دانش کے بحرِ بے کنار تھے۔ہمارے ایک دانش ور دوست تو انہیں اپنے عہد کا امیر خسرو کہتے تھے۔بس وقت بھی بدل گیا اور بندے بھی بدل گئے، ان جیسے لوگ اب کہاں ہیں۔اسی طرح سینئر صحافی مجیب الرحمٰن شامی، قدرت اللہ چودھری، اسد اللہ غالب وغیرہ سے اچھا تعلق رہا اور یہ اور یجنل لوگ ہیں۔ مجھے قدرت اللہ چودھری جیسے زیرک اخبار نویس اور دانش ور نے بھی بہت متاثر کیا۔اسی طرح ایک نوجوان تھا سید خورشید احمد گیلانی، جو ایک عرصہ تک نوائے وقت میں ''قلم برداشتہ'' کے عنوان سے کالم لکھتا رہا اور میں اس کا کالم نہایت عقیدت سے پڑھتا تھا۔اکثر ہماری محفلیں برپا ہوتیں جن کی یادیں آج بھی ماند نہیں پڑیں۔گیلانی صاحب قلم کے بھی دھنی تھے اور خطابت کے بھی۔ وہ سیر حاصل گفتگو کا ملکہ رکھتے تھے۔ ان کی کتابیں علم و ادب کا ایک زبردست سرمایہ قرار پائی ہیں۔اردو ڈائجسٹ کے مدیر اور ممتاز صحافی الطاف حسن قریشی کے ساتھ بھی بہت تعلق رہا اور ہماری خوب علمی، ادبی اور سیاسی محفلیں جمتی تھیں۔

سابق آئی جی پنجاب سردار محمد چودھری سے کون

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

واقف نہیں۔ میری اور چودھری صاحب کی عمر بھی قریب قریب ایک جتنی تھی۔ وہ بھی سرکار کی نوکری کرتے رہے اور میں بھی۔ چودھری صاحب پولیس سروس میں اے ایس پی کے دروازے سے داخل ہوئے اور آئی جی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ چودھری صاحب کے ساتھ ہماری یاداللہ تھی اور کئی بار ان کے گھر پر دوسرے دانش وروں کے ساتھ ساتھ مجھ جیسے "غیر دانش ور" کو بھی جانے کا موقع ملا۔ چودھری صاحب پولیس سروس میں پولیس پر سرداری کرتے رہے اور پھر ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد قلم قبیلہ میں شامل ہوئے اور اہل قلم پر بھی سرداری کی۔ وہ اچھے لکھاری تھے، ان کی چار پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ چودھری صاحب بڑے رکھ رکھاؤ والے اور خاندانی آدمی تھے۔ یاروں کے یار تھے۔ انہوں نے برصغیر کو تقسیم ہوتے ہی نہ دیکھا بلکہ تقسیم کے موقع پر خاندان پر اور خود پر صعوبتیں ٹوٹتے دیکھی تھیں۔ وہ بھارت کے ضلع ہوشیار پور سے ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک گاؤں میں آ بسے تھے۔ انہوں نے نواز شریف کو بہت قریب سے دیکھا بلکہ وہ مختلف حیثیتوں میں نواز شریف کے بہت ہی قریب رہے اور ان کے رازداروں اور صلاح کاروں میں شامل تھے۔

جس وقت پاکستان بنا گو کہ میں بہت چھوٹا تھا اور ساتویں جماعت کا طالب علم تھا لیکن پھر بھی تحریک پاکستان کے حوالے سے بہت سی یادیں ہیں جو جگنوؤں کی طرح ذہن میں جگمگاتی ہیں۔ یہ 1946ء کا زمانہ تھا جب برصغیر میں آزادی کے نعرے گونج رہے تھے اور پاکستان موومنٹ اپنے عروج پر تھی۔ "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے مسلمانان ہند کا جزو ایمان بن چکے تھے۔ ہندو اور انگریز اس سیلاب کے آگے اپنے طور پر بند باندھنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ بڑے بڑے جلسے ہوتے، جلوس نکلتے، گولیاں چلتیں، لاٹھی چارج، پکڑ دھکڑ روز کا معمول تھا۔ میں ان دنوں گورنمنٹ ہائی سکول میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میری عمر کے لڑکے اور تو کچھ کر نہیں سکتے تھے، بس چھوٹی چھوٹی گلیوں اور کوچوں میں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ عمر کچی تھی، سیاست کی باریکیوں سے ناآشنا تھے لیکن دل میں عقیدت اور محبت کی بنیادیں واضح طور پر پختہ تھیں۔ کیونکہ پاکستان ایک عقیدہ بن چکا تھا۔ ایک دن ہمارے سکول کے قریب سے مسلم لیگ کا جلوس گزرا جو ضلع کچہری کی طرف رواں دواں تھا۔ انگریز کا دور تھا اور کچہری انگریز کی طاقت اور ہیبت کی پہچان ہوا کرتی تھی۔ کچہری میں ضلع کے سیاہ وسفید کا مالک انگریز ڈپٹی کمشنر بیٹھا کرتا تھا اور وہاں پولیس کا سخت پہرا ہوتا تھا کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ کسی جلوس کا اس طرف آنا ہی اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن تحریک پاکستان کا یہ جلوس پورے جذبے سے اسی کچہری کی طرف روانہ تھا۔ جس وقت جلوس سکول سے آگے بڑھا تو مسلمان طالب علموں کی کثیر تعداد بھی ساتھ ہو لی۔ ہم بھی اپنا بستہ اٹھائے جلوس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کم سنی تھی لیکن جذبہ صادق تھا۔ اپنے لیڈروں کی محبت دلوں میں موجزن تھی۔ جلوس جس وقت کچہری کی عقبی سمت میں پہنچا تو ایک خوبرو اور گورا چٹا نوجوان جو اس جلوس کا روح رواں تھا پروقار انداز میں آگے بڑھا تو فضا "امیر عبداللہ خان روکھڑی، زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھی۔ یہ نوجوان مسلسل آگے بڑھتا گیا اور کچہری کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا عمارت پر لگے "یونین جیک" کے پاس جا پہنچا۔ یہ یونین جیک عمارت کی سب سے اونچی منڈیر پر نہایت تمکنت سے لہرا رہا

تھا۔ یونین جیک کوئی عام جھنڈا نہ تھا بلکہ سلطنت برطانیہ کی عالمگیر حیثیت کا ایک نشان تھا جس کی عمل داری میں سورج بھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آج چشم فلک نے وہ منظر دیکھا کہ ایک باہمت نوجوان نے غلامی کی اس علامت کو نفرت اور غصے سے اتار کر تار تار کر دیا تھا اور سب لوگ دم بخود ہو گئے تھے۔ پھر اس نوجوان نے جہاں سے انگریز کا جھنڈا اتارا تھا وہاں پاکستان کا علامتی جھنڈا لہرا دیا۔ اس جرم پر امیر عبداللہ خان روکھڑی کو پولیس نے گرفتار کیا اور انہیں چار سال قید کی سزا سنائی گئی لیکن جلد ہی پاکستان بن گیا اور یوں یہ سزا بھی کالعدم ٹھہری۔ میری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا اور یہ واقعہ آج بھی میرے دل و دماغ میں ترو تازہ ہے۔

تحریک پاکستان کا ذکر کروں اور دختر پاکستان آپا خورشید نیازی کا ذکر نہ کروں، یہ کیسے ممکن ہے! آپا خورشید نیازی تحریک پاکستان کی ایک سر بکف مجاہدہ تھیں۔ وہ میری خالہ زاد بہن اور عمر میں مجھ سے دس سال بڑی تھیں۔ آپا خورشید تحریک پاکستان کے معروف کارکن اور سینئر سیاستدان امیر عبداللہ خان روکھڑی کی بیگم ممتاز کی چھوٹی بہن تھیں۔ ہم انہیں آپا کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کی زندگی میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے اور جب میں ورق ورق پر نظر ڈالتا ہوں دل سے آواز آتی ہے: ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے''۔ جس وقت تحریک پاکستان زوروں پر تھی تو آپا کالج میں پڑھتی تھیں اور طلبہ تحریک کی روح رواں تھیں۔ آپا خورشید نیازی نے تحریک پاکستان کی معروف خاتون لیڈر بیگم جی اے خان کے ساتھ مل کر قیام پاکستان کی آواز اٹھائی تھی۔ انہوں نے قیام وطن کے بعد پاکستان میں ''گرل گائیڈ'' کے نام سے ایک تنظیم بھی بنائی۔ 1947ء میں وہ گریجوایشن کر چکی تھیں اور جب صوبہ سرحد کے پاکستان میں شامل ہونے یا نہ ہونے کے لیے ریفرنڈم کا مرحلہ پیش آیا تو آپا ان دنوں بھارتی شہر انبالہ میں تھیں۔ ان کے والد غلام محمد خان نیازی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں وہیں مقیم تھے۔ آپا خورشید نے اس ریفرنڈم میں یوں حصہ لیا کہ اپنے تمام گھر والوں کو انبالہ سے ساتھ لے کر پشاور پہنچیں اور اس ریفرنڈم میں پاکستان کے حق میں ووٹ ڈال کر اس کی بنیادوں میں اپنا حصہ ڈالا۔ ان دنوں انبالہ سے پشاور تک کا سفر آسان نہ تھا لیکن پاکستان کی محبت میں آپا خورشید نے ساری دشواریاں عبور کر کے پاکستان کو ووٹ دیا اور جب پاکستان بن گیا تو آپا اپنے گھر والوں سمیت انبالہ کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ کر لاہور آ گئیں۔ ان کی ان خدمات کے بدلے میں انہیں ادارہ تحریک کارکنان نظریہ پاکستان نے میڈل دینے کا فیصلہ کیا اور کچھ دوست جب انہیں یہ خوشخبری دینے پہنچے تو آپا خورشید نیازی راہی ملک عدم ہو چکی تھیں۔

قیام پاکستان کے فوری بعد میں اصغر مال کالج راولپنڈی میں داخل ہوا۔ مری ان دنوں انگریزوں کا بسایا ہوا ایک چھوٹا سا ہل سٹیشن تھا اور مری اس وقت ''مری'' نہیں تھی بلکہ اپنے پورے حسن اور جوبن پر تھی۔ آبادی خال خال اور ہر طرف گھنے جنگلات تھے۔ ہم بھی کبھی کبھار مری جا نکلتے۔ ایک روز جی پی او سے کشمیر پوائنٹ جاتے ہوئے راستے میں ایک گھر پر مولانا ظفر علی خان کی تختی لگی دیکھی تو رک گئے۔ دوسری طرف دیکھا تو مولانا بہ نفس نفیس سڑک کنارے لاٹھی ٹیکتے آ رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر جو پہلی نظر پڑی اور جو مسرت ہوئی وہ میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بعد عقیدت انہیں سلام

کیا لیکن بات کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ مولانا ان دنوں بہت علیل تھے، چلتے چلتے رک جاتے یا کسی پتھر کا سہارا لے کر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد تو ہمارا معمول بن گیا اور ہم ان کو صرف ایک نظر دیکھنے کی غرض سے وہاں سے گزرتے اور انہیں مودبانہ سلام کر کے آگے بڑھ جاتے۔ یہ سلسلہ کئی دن یونہی چلتا رہا تو ایک روز مولانا نے ہمیں خود روک لیا اور پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو تو اپنی کم مائیگی کے بھرپور احساس سے میں صرف اتنا بتا سکا کہ بس جی ایک طالب علم ہوں۔ اس پر ان کے چہرے پر ایک عجب سے چمک اٹھی اور صرف مجھ سے اتنا کہا: ”سنو! پاکستان بن چکا ہے اور اب آپ ہی نے اس کا مستقبل سنوارنا ہے“۔ ان کے یہ چند الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔

میاں نواز شریف اور شہباز شریف کے والد محترم میاں محمد شریف مرحوم کے ساتھ ہمارا تعلق خاطریوں قائم ہوا کہ وہ سبزہ و گل اور درختوں کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے اور یہی وجہ ہمارے درمیان رابطے کا سبب بن گئی تھی۔ جب نواز شریف پہلی مرتبہ وزیراعظم بنے تو ایک روز میاں محمد شریف کے ایک صنعت کار دوست جو میرے بھی جاننے والے تھے کی معرفت پیغام ملا کہ میں میاں محمد شریف سے ان دفتر میں جا کر ملوں وہ کچھ مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ خیر میں ان کے ڈیوس روڈ پر واقع آفس میں گیا اور ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے نہایت پیار سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو میں دو روز بعد رائے ونڈ روڈ مانگا کے مقام پر ملوں جہاں وہ اپنے صنعتی کمپلیکس کا آغاز کرنے والے ہیں۔ میں دو روز بعد وہاں پہنچا اور دیکھا کہ ایک بے آب و گیاہ وسیع علاقہ اس مقصد کے لیے گھیرے میں لیا جا چکا ہے اور باقاعدہ حد بندی بھی ہو چکی ہے۔ آبادی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک خیمے میں باریش شخص اپنے آگے نقشہ پھیلائے ہوئے ہے۔ میں انہیں میاں شریف کا کوئی ملازم سمجھا اور اپنا تعارف کروایا تو اس نے نہایت انکسار کے ساتھ نقشے کی مدد سے ہمیں سبزہ زاروں اور درختوں کے لیے مخصوص مقامات کی نشاندہی کی۔ دوسرے روز مجھے پتہ چلا کہ وہ نواز شریف کے چھوٹے بھائی عباس شریف ہیں۔ عباس شریف بہت نیک اور ملنسار آدمی تھے۔ بعد میں میں جب بھی وہاں جاتا تو اکثر عباس شریف کسی ریڑھی والے سے کوئی چیز لے کر کھا لیتے اور مجھے بھی کھلاتے۔ عباس شریف اپنے والد کا بہت ہی احترام کرتے اور جونہی ان کی گاڑی آتی وہ لپک کر اس کا دروازہ کھولتے اور پھر نہایت مودبانہ انداز میں کھڑے ہو جاتے۔ میاں محمد شریف جب نہایت باریک بینی سے ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیتے تو ان کی دور بین نظریں چھوٹے سے چھوٹے نقص کو بھی دیکھ لیتیں جو بڑے بڑے انجینئرز بھی نہ دیکھ سکتے۔ میں نے میاں محمد شریف صاحب کو وقت کا بہت پابند پایا تھا۔ وہ مجھے جو بھی وقت دیتے عین اسی وقت پہنچ جاتے۔ انہیں جامن کے درخت اور پھل بہت زیادہ پسند تھے۔ ایک مرتبہ میاں صاحب موڈ میں تھے تو میں نے یونہی مذاق میں کہہ دیا کہ آپ یہاں سوت کا کارخانہ لگانے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی یہاں جامن کے درخت بھی لگانا چاہتے ہیں تو کارخانے کے مزدور جب یہ جامن کھائیں گے اور پھر وہی ہاتھ سوت کو لگائیں گے تو اسے داغدار کر دیا کریں گے۔ میں نے یہ گپ یونہی لگائی تھی لیکن میاں صاحب نے اسے سنجیدہ لیا اور آرڈر دیا کہ بس یہاں جامن کے درخت نہیں لگیں گے۔ میں نے انہیں بہت قریب سے شرافت اور دیانت کے اعلیٰ پیکر کے طور پر دیکھا تھا۔

لاہور کے ایک صاحب میجر رشید وڑائچ بھی تھے جن سے ہماری خاصی یاد اللہ تھی۔ وہ فوج میں رہے اور 1971ء میں مشرقی پاکستان میں جنگی قیدی بن کر بھارت کی قید میں رہے۔ قید کے بہت دردناک واقعات سنایا کرتے۔ میجر وڑائچ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کے بہت زیادہ مداح تھے۔ جہاں کہیں نیازی کا تذکرہ چھڑتا اور ان پر تنقید ہوتی تو میجر وڑائچ ان کا بھرپور دفاع کرتے۔ انہوں نے فوج میں جانے کے خواہشمند لوگوں کے لیے ایک اکیڈمی بھی کھول رکھی تھی۔ جب بھی ملتے جلدی میں ہوتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کٹھن مہم کے درپے ہیں۔ کچھ نہ کچھ بہرحال کرتے ہی رہتے۔ دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے ہر وقت مستعد رہتے۔ ان کا معمول تھا کہ صبح سویرے گھر سے کھانا اور چائے تیار کروا کر چوبرجی پہنچ جاتے اور وہاں بیٹھے مزدوروں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے۔ وہ معرکہ حق و باطل میں فولاد تھے تو حلقہ یاراں میں ریشم کی طرح نرم۔ انہوں نے ایک حزب اللہ تحریک بھی بنا رکھی تھی اور عراق کے سابق صدر صدام حسین کی قد آدم تصویر لاہور نہر کنارے واقع اپنے گھر کی چھت پر لگا رکھی تھی جس پر ہر گزرنے والے کی نظر پڑتی۔ غرض میجر صاحب مرحوم عجب شخصیت کے مالک تھے۔

اپنے ملنے والے بے شمار لوگوں میں ایک باغ و بہار شخصیت سینئر صحافی کلیم اللہ ملک مرحوم کی بھی تھی۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کا اصل نام کریم اللہ تھا اور اپنے سحر طراز کلام کی وجہ سے کلیم اللہ مشہور ہو گئے تھے اور یہی نام ان کی پہچان بن گیا۔ وہ میانوالی کے رہنے والے تھے۔ ہفت روزہ چٹان سے منسلک تھے۔ نوائے وقت، ماہنامہ تعلیم القرآن اور اردو ڈائجسٹ میں بھی باقاعدہ لکھتے۔ کلیم اللہ ملک مرحوم بلا کے کمپیئر اور مقرر تھے۔ میں کلیم اللہ ملک جیسے عظیم انسان کے متعلق یہی کہتا ہوں کہ: ''جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا''۔ یعنی کلیم اللہ ملک نے میانوالی میں ہی اپنا حلقہ محدود کر رکھا تھا وہ اگر لاہور جیسے شہر میں ہوتے تو ان کے اوصاف زمانے پر کھلتے۔ وہ لاہور بھی آتے رہتے لیکن رہائش میانوالی ہی میں رکھی۔

زمانہ طالب علمی کے بہترین دوستوں کو یاد کروں تو ان میں ایک کیپٹن حمید اللہ سنبل شہید تھے۔ ہم ساتویں سے دسویں جماعت تک اکٹھے ہی پڑھتے رہے اور ہر وقت ساتھ رہتے۔ حمید اللہ کو آرمی میں جانے کا بہت شوق تھا اور ابھی وہ بی ایس سی کا طالب علم تھا کہ پی ایم اے میں اپلائی کیا اور سلیکٹ ہو کر کاکول پہنچ گیا۔ کاکول سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد اس نے کمانڈو کا خصوصی کورس بھی کیا۔ ستمبر 65ء کی جنگ سے پہلے وہ کیپٹن بن چکا تھا۔ مورخہ 6 ستمبر کو حمید اللہ سنبل کو چار جانباز ساتھی دیے گئے اور ایک انتہائی مشکل ٹاسک سونپا گیا کہ سیالکوٹ میں جسٹر کے مقام پر حملہ کر کے جسٹر پُل کو دشمن کے قبضے سے چھڑائیں۔ یہ مختصر دستہ چار روز تک مسلسل دشمن سے لڑتا رہا اور اسی کارروائی کے دوران میں حمید اللہ نے جام شہادت نوش فرمایا۔

اپنی زندگی سے جڑی اہم باتوں، واقعات اور پراجیکٹس کو یاد کرتا ہوں جن میں کہیں نہ کہیں میرا کردار بھی کارفرما رہا تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں یہاں لاہور شہر کے عین وسط میں بہنے والی نہر کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ اس پراجیکٹ کی لینڈ سکیپنگ اور شجرکاری میرے دور میں بلکہ میری ہی نگرانی میں انجام پائی۔ یہ دو مرحلوں میں مکمل ہوئی۔ نہر کا پہلا مرحلہ 1964ء میں جیل روڈ سے لے کر دھرم پورہ پل تک ہم نے مکمل کیا اور دوسرا مرحلہ ٹھوکر نیاز بیگ

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

تک ٹھیک دس سال بعد 1974ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ میں جب بھی اس نہر کے آس پاس سے گزرتا ہوں تو راحت محسوس ہوتی ہے اور لگتا ہے جیسے یہ نہر، یہ پودے اور درخت میرے بچے ہوں کیونکہ ہر پودے اور درخت میں میری اور میری ٹیم کی عرق ریزی شامل ہے۔ محکمہ جنگلات سے وابستہ تقریباً ہر شعبے میں میرا کسی نہ کسی صورت میں حصہ رہا۔ فیلڈ میں بھی کام کیا اور انتظامی امور میں بھی۔ کچھ عرصہ فاریسٹ سکول گھوڑا گلی کا پرنسپل بھی رہا۔ میں نے اپنا کام حتی الوسع دلجمعی اور لگن سے کیا، یہ میں نہیں کہتا بلکہ میرے محکمہ کے لوگ کہتے ہیں اور مجھے آج بھی میرے جاننے والے اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔

جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں پنجاب کے گورنر جیلانی مرحوم تھے، وہ بہت ہی بھلے مانس اور ایماندار انسان تھے۔ جب میں ڈسٹرکٹ فاریسٹ آفیسر ڈیرہ غازی خان تعینات ہوا تو اس وقت وہ دورے پر آئے اور فورٹ منرو سیاحتی مقام کی بنیاد رکھی اور وہاں پر تیزی سے کام شروع کیا اور اسے پبلک پارک کے طور پر ڈیکلیئر کیا۔ اس سے قبل فورٹ منرو سرسبز وشاداب اور پہاڑی علاقہ تھا اور ہر طرف جنگل ہوتا تھا۔ گورنر جیلانی کی ذاتی دلچسپی سے اسے سیاحتی مقام کا درجہ ملا۔ فورٹ منرو میں تمام کام ہم نے ہی مکمل کروایا۔ اسی دور میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ گورنر جیلانی جس علاقے میں بھی دورہ کرنے جاتے اکثر بغیر پروٹوکول کے اچانک پہنچ جاتے اور جائزہ لیتے کہ کام کیسا ہو رہا ہے۔ ایک مرتبہ ملتان اور ڈیرہ غازی خان کے درمیان غازی گھاٹ پل تعمیر ہو رہا تھا کہ انتظامیہ میں کھلبلی مچ گئی کہ گورنر صاحب خفیہ دورے پر آ رہے ہیں جب جیلانی صاحب سائٹ پر پہنچے تو وہاں ہر طرف بیوروکریسی تھی اور کام تیزی سے جاری تھا۔ افسر شاہی نے گورنر کو بتایا کہ ہم تو معمول کے مطابق روزانہ ہی یہاں آتے ہیں اور کام کا جائزہ لیتے ہیں۔ خیر گورنر خاموش رہے اور کچھ دیر کے بعد ملتان چلے گئے۔ ملتان پہنچ کر انہوں نے اسی وقت پھر واپسی کی راہ لی اور غازی گھاٹ پل کے پاس پہنچ گئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں صرف مزدور کام کر رہے ہیں اور دور دور تک افسرانِ بالا کا کوئی نام ونشان تک نہیں۔ اس پر گورنر جیلانی نے خوب بھڑاس نکالی اور افسران کی ''گوشمالی'' کی۔

گورنر جیلانی صاحب زبردست آدمی تھے۔ جس وقت میں ڈسٹرکٹ فاریسٹ آفیسر لاہور تعینات ہوا تو جیل روڈ لاہور پر واقع ریس کورس کے متعلق بیوروکریسی نے بہت زور لگایا کہ اس علاقے کو بھی ''جی او آر'' کا حصہ بنایا جائے، انہوں نے جیلانی کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانے اور انہوں نے یہاں پر خوبصورت پبلک پارک بنوا دیا جسے بعد میں ''جیلانی پارک'' کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ اسی طرح جیلانی پارک کے سامنے پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی بھی جیلانی مرحوم کی کاوش تھی۔ 2005ء میں پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں میری انجیو پلاسٹی ہوئی اور میں صحت یاب ہو گیا۔ میں ہسپتال سے ڈسچارج ہو رہا تھا تو مجھے جیلانی یاد آ رہے تھے کہ انہوں نے مخلوق خدا کی خدمت کے لیے کیسا زبردست ادارہ قائم کیا، ویسے حق تو یہی بنتا تھا کہ اس ادارے کا نام بھی انہی کے نام پر رکھا جاتا۔ اصل میں وہ کام کرنے والے لوگ تھے۔ انہیں جو قومی ذمہ داری سونپی جاتی اسے پوری لگن کے ساتھ انجام

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

دیتے تھے۔ ایک بار جیلانی صاحب کوٹ مٹھن گئے تو وہاں بھی ایک بہت بڑے پبلک پارک کی بنیاد رکھی۔ جیلانی کو درختوں، پارکوں اور جنگلات کا بہت شوق تھا اور جس ضلع اور مقام پر بھی جاتے وہاں ایک آدھ پارک ضرور بنوا دیتے۔ وہ کہتے تھے کہ درختوں اور پودوں سے معاشرتی فضا بہتر رہتی ہے جس کا انسانی صحت اور مزاج پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ جلو پارک لاہور بھی گورنر جیلانی کے دور میں ان کے حکم پر بننا شروع ہوا تھا۔ جس وقت جلو پارک میں کام جاری تھا تو ایک دن اچانک گورنر صاحب اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتے ہوئے وہاں جا پہنچے۔ ان دنوں بارشیں بہت ہو رہی تھیں اور ہر طرف کیچڑ تھا، جلو پارک کے قریب پہنچ کر جیلانی صاحب کی گاڑی کیچڑ میں دھنس گئی، وہ مسلسل کوششیں کرتے رہے لیکن گاڑی نہ نکلی۔ وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تو ان کی حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ یہ تو گورنر پنجاب ہیں۔ یوں لوگوں نے مل کر ان کی گاڑی نکالی۔ جلو کا علاقہ جنگل تھا اور جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ اسے جیلانی نے ڈویلپ کروایا۔ میرے ڈسٹرکٹ فاریسٹ آفیسر لاہور تعینات ہونے سے پہلے ہی وہاں کام شروع ہو چکا تھا۔ میرے دور میں بھی کام عروج پر رہا اور بعد میں بھی وہاں ترقیاتی کام ہوتے رہے، بلکہ اب تک کام جاری ہے۔

1970ء کے الیکشن میں مجھے قصور میں پریزائڈنگ افسر تعینات کیا گیا تھا۔ یہاں پر قومی اسمبلی کے امیدوار احمد رضا خان قصوری تھے جو ان دنوں جوان تھے۔ اس دور میں ہر طرف پیپلز پارٹی اور ذیڈا اے بھٹو کا طوطی بول رہا تھا۔ سچ بتاؤں تو ان دنوں میری ہمدردیاں بھی پی پی اور قصوری کی جانب تھیں لیکن میں اللہ کے فضل و کرم سے آج بھی پرسکون ہوں کہ میری ہمدردیاں ضرور اس پارٹی کے ساتھ تھیں لیکن ہم نے پولنگ میں کسی قسم کی کوئی ہیر پھیر نہیں کی اور شفافیت کو یقینی بنایا۔ احمد رضا قصوری لڑکا تھا اور یہ اس کا پہلا الیکشن تھا اور اسے اپنی جیت کا قطعاً کوئی یقین نہ تھا۔ جب رزلٹ آنا شروع ہوئے تو پورے حلقے میں احمد رضا خان قصوری اپنے لوگوں کو لے کر جلوس نکالنے اور احتجاج کرنے لگا کہ بہت دھاندلی ہو رہی ہے اور مجھے بھاری ووٹوں سے ہرا دیا جائے گا۔ دراصل اسے اپنی شکست یقینی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہمارے پولنگ پر آیا تو مجھ سے بھی اس کی تو تکار ہوئی تو میں نے کہا کہ یار تم رزلٹ تو مکمل آنے دو پھر کوئی بات کرنا۔ چنانچہ جب رزلٹ آیا تو وہ بھاری مینڈیٹ سے جیت گیا۔ بعد میں وہ مجھے کہا کرتا تھا کہ اصل میں مجھے اپنی جیت کا کوئی اندازہ نہ تھا، اس لیے میں نے شور مچا دیا تھا۔

1971ء ہی کا واقعہ ہے کہ بیدیاں کے مقام پر مجھے پاک فوج نے بلوایا اور کہا کہ اس علاقے سے سارے درخت کٹوا دیں، ان دنوں پاک بھارت فوجیں آمنے سامنے تھیں۔ خیر میں نے ایک ٹھیکیدار کو کہہ کر وہاں سے درخت کٹوا دیے ابھی درخت اٹھائے نہیں گئے تھے کہ پاک فوج نے اس علاقے میں بارودی سرنگیں بچھانا شروع کر دیں اور بعد میں جب وہ ٹھیکیدار درخت اٹھانے گیا تو فوج نے کہا آپ واپس چلے جاؤ کیونکہ اب حالات بہت خراب ہو چکے ہیں۔ وہ ٹھیکیدار بہت پریشان حالت میں میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جناب میرا اتنا خرچ اٹھ گیا اور آپ مجھے فوجی درخت نہیں اٹھانے دیتے، چونکہ یہ سودا آپ نے کروایا تھا لہٰذا آپ میرے ساتھ چلیں۔ خیر ہم دونوں بیدیاں جا پہنچے تاکہ فوجی حکام سے اس کی سفارش کی جا سکے۔ میں یہ دیکھ کر حیران

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

رہ گیا کہ جو فوجی حکام میری عزت کرتے تھے آج ان کا موڈ یکسر بدل چکا تھا اور ہمارے وہاں پہنچتے ہی انہوں نے کہا کہ آپ لوگ فوری طور پر یہاں سے نکل جائیں کیونکہ حالات بہت خراب ہونے جا رہے ہیں لیکن ہمیں ان کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے ہماری ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے کہ آپ فوری یہاں سے نکل جائیں۔ اب شام کے سائے پھیلنے لگے تھے اور پھر اچانک ہی بلیک آؤٹ شروع ہو گیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ جب ہم موٹر سائیکل پر واپسی کی راہ لے رہے تھے تو عین اسی وقت اچانک جنگ چھڑ گئی اور دونوں طرف سے گولہ بارود کا آزادانہ استعمال شروع ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر ہم پسینے میں شرابور ہو گئے کہ ہم کہاں پھنس گئے ہیں۔ خیر بڑی مشکل سے لاہور پہنچے تو ہر طرف اندھیرا تھا، سڑکیں اور گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ پھر کچھ دن کے بعد ہی سانحہ مشرقی پاکستان رونما ہو گیا۔ آج بھی مجھے یہ واقعہ یاد آتا تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اُدھر جنگ چھڑنے کو تھی اور اِدھر ہمیں اپنے درختوں کی پڑی ہوئی تھی۔

اپنی یادوں کو کریدنے بیٹھا ہوں تو یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کا سابق کپتان مصباح الحق میرا بھتیجا ہے اور میرے کزن بھائی عبد القدوس خان نیازی کا بیٹا ہے۔ عبدالقدوس خان اور میں اکٹھے ہی پلے بڑھے اور ایک ہی جگہ تعلیم حاصل کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مصباح الحق نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تو ان دنوں چونکہ میڈیا اتنا فاسٹ نہیں ہوا کرتا تھا اور لوگوں کو بہت سی باتوں کا فوراً پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ مصباح الحق انضمام الحق کا بھائی یا کزن وغیرہ ہے۔ بلکہ ایک صاحب نے مجھے ہی کہہ دیا تھا کہ مصباح الحق انضمام الحق کا بھائی ہے۔ ان دنوں میں نوائے وقت میں کالم ''گر تو برا نہ مانے'' لکھتا تھا۔ میں نے مصباح الحق کے متعلق لکھا تو لوگوں کو پتا چلا کہ وہ میانوالی کا ہے اور میرا بھتیجا ہے۔ مصباح کے والد عبدالقدوس خان نیازی اور میں راولپنڈی میں اکٹھے پڑھتے رہے۔ وہ ہاکی کے بڑے اچھے پلیئر تھے۔ مصباح کی والدہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین میانوالی کی پرنسپل بھی رہیں وہ بہت اچھی ایتھلیٹ بھی تھیں۔ مصباح الحق نے بھی شروع شروع میں سٹوڈنٹ دور میں ہاکی کھیلنا شروع کی، وہ اس کھیل میں بہت آگے نکلتا کیونکہ وہ ہاکی کا اچھا کھلاڑی تھا لیکن بعد میں وہ لاہور آیا تو یہاں اس نے کرکٹ کھیلنا شروع کی اور اپنا خوب نام کمایا۔ یہ ہمارے خاندان کا نہایت محنتی اور ذہین بچہ تھا اور محض اپنی محنت اور لگن کے بل بوتے ہی پر کرکٹ ٹیم کے کپتان کے اعلیٰ عہدے تک پہنچا۔ اس نے نہ صرف اپنا نام کمایا بلکہ پوری برادری اور پوری پاکستانی قوم کا نام روشن کیا۔

خزینہ علم و ادب پبلشرز نے میرے کالموں، مضامین اور شاعری کو یکجا کر کے کتابی صورت دینے کا کام شروع کیا ہے۔ اب تک میری نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک شعری مجموعہ ہے اور باقی نثری مضامین ہیں۔ اللہ کے خصوصی فضل و کرم سے میرے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں امریکہ میں سیٹل ہیں اور باقی دو بیٹیاں لاہور میں ہیں۔ ماشاءاللہ میرے تمام بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور سبھی میں لٹریری ذوق موجود ہے۔ بس زندگی ایسی کٹ گئی کہ جیسے ایک خواب تھا۔ بقول کیفی بلگرامی:

اِک اِک قدم پہ رکھی ہے یوں زندگی کی لاج
غم کا بھی احترام کیا ہے خوشی کے ساتھ

O……❀……O

Scanned with CamScanner
Scanned with CamScanner